# موجودہ سیاسی صورتحال میں مسلمان کیا کرے؟

ڈاکٹر محمد منظور عالم

جمہوریت میں سیاست اس کے اہم ترین ستونوں میں سے ایک ہے اور اگر اس ستون کو جمہوری نظام سے الگ کر دیا جائے تو یہ ڈکٹیٹر شپ ہو جائے گی۔ اس لحاظ سے ہمارے ملک کے دستور سازوں نے یہاں کے مختلف طبقات، مذہبی اکائیوں اور تہذیب و ثقافت کو باہم ایک کڑی میں پروئے رکھنے کے مقصد سے ایسا دستور وضع کیا جس سے یہاں رہنے والی سبھی اکائیوں کی خواہشات کی تکمیل بھی ہو سکے اور ملک بھی متحدرہ سکے۔ اس کے لیے ملک کے عوام کو یہ آزادی دی کہ وہ اپنی مرضی کی حکومت بنانے میں مدد کریں۔

ہندوستان نے اس معاملے میں دنیا کے سامنے ایک عظیم مثال پیش کی ہے۔ جمہوری نظام کے تحت ہر پانچ سال پر الیکشن کا نظم ہے۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ کچھ مواقع پر یہ انتخابات پانچ سال سے کم عرصہ میں بھی منعقد ہو جاتے ہیں۔ الیکشن کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ وہ عوام کے سامنے مختلف افراد چاہے وہ آزاد امیدوار کے طور پر ہوں یا پارٹی کے نمائندہ کی شکل میں اپنی بات کو مینی فیسٹو کی شکل میں عوام تک پہونچاتے ہیں اور یہ الیکشن کی روح مانی جاتی ہے۔ اسی مینی فیسٹو کی بنیاد پر عوام اپنی پسند کے لحاظ سے پارٹی اور اس کے امیدواروں کو منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں تا کہ حکومت کی تشکیل ہو سکے اور وہ حکومت دستور کا پاس رکھ سکے۔

انتخابات میں مینی فیسٹو کے ذریعہ عوام کو خوش کرنے کے لیے بے شمار باتیں پیش کی جاتی ہیں اور جب وہ پارٹی جسے عوام نے اپنے ووٹ کے ذریعہ ایوان تک پہونچایا ہے تو وہ اپنے مینی فیسٹو میں سے تھوڑے بہت پر عمل کرتی ہے تا کہ اس کے کیے ہوئے کام کو دوسرے الیکشن میں مزید خوبصورت لبادے میں پیش کیا جا سکے۔ اس طرح عوام کی ذہانت، ان کے بھروسہ اور ان کی سوجھ بوجھ کا امتحان لیا جاتا ہے۔

اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ جو قومیں یا اکائیاں کمزور ہوتی ہیں اور علم کے جگہ جہالت جس کی زندگی میں بس جاتی ہے وہ اقتصادی طور پر کمزور ہوتی ہیں اور انکے اندر خوف و ہراس پروان چڑھنے لگتا ہے یا ان اکائیوں کو ایسے ماحول میں رکھا جاتا ہے جہاں انھیں اپنی زندگی کو عزیز رکھتے ہوئے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے قد آور شخصیات یا بڑی بڑی پارٹیوں کے اعلان پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے ووٹ کا استعمال کرنا پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں یہ کمزور طبقات بالخصوص مسلمان ووٹ بینک کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے۔

آزاد ہندوستان کی 65 سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے زیادہ تر ووٹ بینک کے طور پر اپنے عمل کا اظہار کیا ہے۔ دوسری جانب جب اس عمل سے مسلمانوں میں مایوسی بڑھنے لگی تو انھیں دستور کا سبق یاد آنے لگا اور مسلمانوں میں ایک ہوڑ سی لگ گئی کہ کیسے اپنے اپنے گروہ اور اپنی اپنی ضروریات کے مطابق مختلف خطے میں نئی نئی مسلم سیاسی پارٹی قائم کریں۔ اس کے نتیجہ میں صورتحال یہ پیدا ہوتی چلی گئی کہ اس سے انتشار فکر، انتشار عمل اور سیاسی بصیرت کا فقدان پیدا ہوا اور وہ بڑے سیاسی لیڈروں کے دام میں پھنستا چلا گیا۔

ادھر گذشتہ 15 سالوں میں بالعموم مسلمانوں اور بالخصوص مسلم نوجوانوں میں ایک شعور بیدار ہونے کے مرحلے سے گذر رہا ہے، جہاں ملت کو مشکلات کا اندازہ ہوتا جا رہا ہے، وہاں وہ اپنی بے بسی کو بھی سمجھنے لگی ہے۔ گو کہ ملت کی جانب سے سیاسی شعور کا اظہار کیا جانے لگا ہے لیکن ابھی اس لائحہ عمل کو طے کرنے اور سیاست کی پیچیدگیوں کو سمجھ کر بصیرت کے ساتھ حکمت عملی طے کرنے میں ملت بہت پیچھے ہے۔ پھر بھی گذشتہ 15 سالوں میں مسلمانوں نے اس شعور کے ساتھ ووٹ دیا کہ وہ کسی ایک پارٹی کا ووٹ بینک بننے سے بچ سکیں اور اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی نمائندگی اسمبلیوں میں بڑھ سکے۔ اس تعلق سے مغربی بنگال، آسام، بہار اور اتر پردیش وغیرہ میں کوششیں بھی ہوئیں۔ اس وقت ہر ریاست کی جو انفرادیت ہے اور اس میں مسلمانوں کا جو رول رہا ہے اس پر ریاستی تجزیہ مقصود نہیں ہے بلکہ عمومی تجزیہ کرنے کی محض ایک کوشش

ہے۔ سبھی ریاستوں میں یہ بات مشترک رہی ہے کہ مسلمانوں کی نفسیات کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے ان کی کمزوریوں کو جانتے ہوئے کچھ ایسے پروگرام کا اعلان کیا جائے جس سے مسلمانوں میں ایک امنگ پیدا ہو اور جس سیاسی پارٹی کی حکمرانی میں مایوسی پیدا ہو چکی ہو اس کے خلاف کھڑا ہوا جائے۔ اس کام میں ممتا بنرجی کامیاب ہوئیں نتیش کمار بھی کامیاب ہوئے اور ملائم سنگھ تو پوری طرح کامیاب رہے۔

اتر پردیش کی سماج وادی پارٹی نے ریاستی انتخابات سے قبل ایک اچھا منی فیسٹو پیش کر کے مسلمانوں کو مختلف میدانوں میں ترقی دینے اور مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کا وعدہ کرتے ہوئے ان کی شکایات کو دور کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ اسی یقین دہانی پر ریاست کے مسلمانوں نے سماج وادی پارٹی پر بھروسہ کیا جس کے نتیجہ میں سماج وادی کو توقع سے زیادہ سیٹیں حاصل ہوئیں۔ ملائم سنگھ یادو کے فرزند اکھلیش یادو نے ریاست کی کمان سنبھالی تو مسلمانوں کو لگا کہ اب ان کے مسائل حل ہوں گے اور وہ سکھ چین سے رہ سکیں گے لیکن مسلمانوں کے سارے خواب ایک ایک کر کے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ محض ایک سال کی مدت میں 30 سے زائد فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ ان کو نہ تو انصاف ملا اور نہ ہی معاوضہ۔ جو معاوضہ متاثرین کو ملا، اسے مونگ پھلی کی طرح تقسیم کر دیا گیا اور اسی طرح آفیسروں کا تبادلہ تو کر دیا گیا لیکن نہ تو فسادیوں کو سزا دینے کا کوئی طریقہ کار بنایا گیا اور نہ ہی قصورواروں کو سزا دی گئی۔ منی فیسٹو میں مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کا وعدہ کیا گیا لیکن یہ ریزرویشن دستور میں ترمیم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اس کو پورا کرنے کے لیے کوئی کوشش بھی نہیں کی گئی۔

ریاست میں واقع اقلیتی کمیشن اور دیگر اقلیتی اداروں کا حال کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ آج بھی اپنے بجٹ اور ذمہ دار کے انتظار میں خود ہی بے یار و مددگار حسرت و یاس سے حکومت کی جانب نظریں گڑائے ہوئے ہیں۔ جب سماج وادی حکومت کو یہ اندازہ ہونے لگا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ناراض ہو رہی ہے تو اس بات کی کوشش شروع ہو گئی کہ مسلم قیادت میں اختلاف کیسے پیدا کیا جائے۔ اس کا بہت ہی خوبصورت اور مضبوط انداز میں استعمال شروع ہو گیا۔ کبھی ایک قائد جس کی آواز بلند بانگ انداز میں سنی جاتی ہے اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا جاتا ہے تو کچھ ہی دن میں اپنی پارٹی کی عظیم آواز کو اہمیت دی جانے لگتی ہے اور اس بلند آواز کو کمزور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی ایک مسلک کے قائدین کے اندر پائے جانے والے اختلاف کو ہوا دی جاتی ہے اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اچھا ہے اور کبھی کچھ دوسرے مسلک کو اچھا بتایا جاتا ہے، کبھی دوسرے کی بات مانتے ہوئے کچھ مشکل گھڑی میں پوری طرح سے مدد کی جاتی ہے اور انکی بجا شکایتوں کو حل کرنے کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے، کبھی دوسرے مسلک کے آستانہ پر حاضری دی جاتی ہے اور اسی شہر میں دونوں مسالک کے درمیان اختلافات کو بڑھانے میں پٹرول ڈالنے کا کام کیا جاتا ہے، کبھی کسی ایک تنظیم کو بڑی اہمیت دے کر اس کو بڑھایا جاتا ہے تو کبھی اس تنظیم کو نظر انداز کر کے دوسری تنظیم کو بڑھاوا دینے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر انتشار فکر و اعتماد اور ردعمل تیز ہو جاتا ہے اور یہ وہی طریقہ ہے جسے انگریزی کے دور میں اختیار کیا جاتا تھا یعنی تقسیم کرو اور حکومت کرو (Divide and Rule)۔

دوسری طرف جب حکومت کو یہ محسوس ہونے لگا کہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے سے انھیں زیادہ ووٹ مل سکتا ہے چونکہ اس ملت کے اندر اتحاد نہیں ہے تو بہت چھوٹے چھوٹے کام کر دینے سے جذبات کی تسکین ہو گی اور ان کے حق میں ووٹ جانے لگے تو وہ اس پر عمل کرنے لگے۔ کچھ لیڈروں کو اس کا اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں مسلمانوں کا ووٹ ان کے تضاد عمل سے متاثر ہو گیا اور انھیں ووٹ نہ مل سکا تو ان لیڈروں نے فرقہ پرست پارٹی کی بھی تعریف شروع کر دی اور پھر فاسزم کے تئیں محبت جاگنے لگی۔ ایسی شخصیت جس کی پوری زندگی نفرت، غلط بیانی اور جھوٹ پر گذری ہو اسے سرٹیفکیٹ دیا جانے لگا کہ ''وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

یہ صورتحال مسلمانوں سے سوال کرتی ہے کہ کیا ہم مسلمان اپنے اندر بصیرت پیدا نہیں کر سکتے؟ کیا ہم مسلمان اتحاد کی راہیں تلاش نہیں کر سکتے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے فرمان 'اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو' کے حکم پر چلنے کی کوشش نہیں کر سکتے؟ کیا ہم نے اپنا یہ مقدر بنالیا ہے کہ ہم 72 فرقوں میں تقسیم ہو کر رہیں گے جہاں ہماری کوئی آواز نہیں ہو گی۔ کیا ہم درخت کے گرتے ہوئے پتے بنتے رہیں گے جو ہوا کے دوش پر یا تو

اڑا دیئے جاتے ہیں یا اسے لوگ جوتے سے مسل کر آگے بڑھ جاتے ہیں؟

یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اگر منافقت کی سازشوں کو سمجھنے اور ان کی چالوں کا تجزیہ کرنے اور ان کے طور طریقوں پر سوچ وفکر کر کے آگے بڑھنے میں ہم نے مزید تاخیر کی تو شاید ہماری حالت ان قوموں کی طرح ہو جائے گی جسے ہزاروں سال تک استحصال کیا گیا ور جس سے خدمت لی گئی اور اسے کبھی انعام واکرام سے نوازا نہیں گیا، جسے زندہ رہنے کی اجازت دی گئی لیکن زندگی گذارنے کی توانائی دینے سے روکا گیا ،جس سے کام لیا گیا اسے برابری کا مقام نہیں دیا گیا اور جسے حکم پر عمل کرنے پر مجبور کیا گیا لیکن فیصلے میں کبھی شامل نہیں کیا گیا۔

(مضمون نگار آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں)